لیٹ گیا۔ مٹھو اپرشاد کے انتظار میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پیسے نکال کر دیئے کہ ستو گڑ لا کر کھالے۔ مٹھو خوش ہو کر بنیے کی دکان کی طرف دوڑا۔ لڑکوں کو ستو اور چربن روٹیوں سے لذیذ تر معلوم ہوتا ہے۔

سورداس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک سب لوگ سناٹے میں بیٹھے رہے۔ اس کی مخالفت نے ان کو شک میں ڈال دیا تھا۔ اس کی صاف گوئی سے سب لوگ ڈرتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ جو کہتا ہے، اسے پورا کر دکھاتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ پہلے سورداس ہی سے نبٹ لیا جائے۔ اس کو قایل کرنا مشکل تھا۔ دھمکی سے بھی کوئی کام نہ نکل سکتا تھا۔ نایک رام نے اس پر لگے ہوئے الزام کی تائید کر کے اسے شکست دینا تجویز کیا۔ بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اندھے کو پھوڑ لیا۔''

بھیرو: مجھے بھی یہی شک ہوتا ہے۔

جگدھر: سورداس پھوٹنے والا آدمی نہیں ہے۔

بجرنگی: کبھی نہیں۔

ٹھاکر دین: ایسا سوبھاؤ تو نہیں، پر کون جانے کسی کی نہیں چلائی جاتی۔ میرے ہی گھر چوری ہوئی تو کیا باہر کے چور تھے۔ پڑوسیوں کی ہی کرتوت ہے۔ پورے ایک ہزار کا مال اٹھ گیا اور وہی لوگ جنھوں نے مال اڑایا اب تک میرے دوست بنے ہوئے ہیں۔ آدمی من چھن بھر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

نایک رام: شاید زمین کا معاملہ کرنے پر راضی ہو گیا ہو۔ پر صاحب نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو بنگلہ میں آگ لگا دوں گا (مسکرا کر) بھیرو میری مدد کریں گے ہی۔

بھیرو: پنڈا جی! تم لوگ میرے اوپر شبہ کرتے ہو۔ پر میں جوانی کی قسم کھاتا ہوں جو اس جھونپڑے کے پاس گیا بھی ہوں۔ جگدھر میرے یہاں آتے جاتے ہیں۔

ایمان سے پوچھیے انہیں سے۔

نا یک رام: جو آدمی کسی کی بہو بیٹی پر بری نگاہ کرے، اس کے گھر میں آگ لگانا برا نہیں۔ مجھے پہلے تو بسواس نہیں آتا تھا پر آج اس کے مجاج (مزاج) کا رنگ بدلا ہوا ہے۔

بجرنگی: پنڈا جی! سورداس کو تم آج سے تیس برس سے دیکھ رہے ہو۔ ایسی بات نہ کہو۔

جگدھر: سورداس میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں، پر یہ برائی نہیں ہے۔

بھیرو: مجھے بھی ایسا جان پڑتا ہے کہ ہم نے نا ہک (ناحق) اس پر کلنک لگایا۔ سبھاگی آج سویرے آ کر میرے پیروں پر گر پڑی اور تب سے گھر کے باہر نہیں نکلی۔ سارے دن اماں کی سیوا ٹہل کرتی رہی۔

یہاں تو یہی باتیں ہوتی رہیں۔ پر بھوسیوک کی خاطر مدارت کیونکر کی جائے گی۔ ادھر پر بھوسیوک گھر چلے تو آج کے کام پر ان کو وہ خوشی نہ تھی جو نیک کام کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل مطمئن تھا۔

کوئی شریف آدمی برے کلمات کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہی کرنا چاہیے۔ اگر کوئی گالیاں کھا کر چپ ہو رہے تو اس کے معنے یہ ہیں اس میں مردانگی نہیں ہے۔ خودداری نہیں ہے۔ گالیاں کھا کر بھی جس کے خون میں جوش نہ آئے، وہ بے جان اور مردہ ہے۔

پر بھوسیوک کو افسوس یہ تھا کہ میں نے یہ نوبت آنے ہی کیوں دی۔ مجھے ان سے دوستی کرنی چاہیے تھی۔ ان لوگوں کو طاہر علی کے گلے ملانا چاہیے تھا مگر یہ زمانہ سازی کس سے سیکھوں؟ اونہہ! یہ چالیں وہ چلے جسے پھیلنے کی چاہ ہو۔ یہاں تو سمٹ کر رہنا چاہتے ہیں۔ پاپا سنتے ہی جھلا اٹھیں گے۔ سارا الزام میرے ہی سر تھوپیں گے۔ میں ہی کوتاہ فہم۔ نامصلحت شناس۔ ناتجربہ کار ہوں۔ ضرور ہوں۔ جسے دنیا میں رہ کر دنیا

داری نہ آئے وہ ضرور خردماغ ہے۔ پاپا ناخوش ہوں گے۔ میں خاموشی سے ان کی ناخوشی برداشت کرلوں گا۔ اگر وہ میری طرف سے مایوس ہوکر یہ کارخانہ کھولنے کا ارادہ ترک کردیں تو میں منہ مانگی مراد پاجاؤں۔

لیکن پربھوسیوک کو کتنا تعجب ہوا جب سارا ماجرا سن کر بھی جان سیوک کے چہرہ پر غصہ کی کوئی علامت نمودار نہ ہوئی۔ یہ خاموشی تنبیہ و تہدید سے زیادہ ناقابل برداشت تھی۔ پربھوسیوک چاہتے تھے کہ پاپا مجھے خوب تنبیہ کریں کہ مجھے اپنی صفائی دینے کا موقع ملے۔ میں ثابت کردوں کہ اس ناگوار واقعہ کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میرے بجائے کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس پر بھی یہی افتد پڑتی۔ انہوں نے دو ایک بار اپنے والد کے غصہ کو مشتعل کرنے کی کوشش کی، لیکن جان سیوک نے صرف ایک مرتبہ ان کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور اٹھ کر چلے گئے۔ کسی شاعر کی داد پانے کی تمنا سامعین کے سکوت سے اتنی برباد نہ ہوئی ہوگی!

مسٹر جان سیوک چھلکے ہوئے دودھ پر آنسو نہ بہاتے تھے۔ پربھوسیوک کے کام کی برائی کرنا بے سود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے خود ہی اس جذبہ کی پرورش کی تھی۔ سوچنے لگے اس گتھی کو کیسے سلجھاؤں۔ نایک رام محلّہ کا مکھیا ہے۔ سارا محلّہ اس کے اشارہ پر ناچتا ہے۔ سورداس تو محض برائے نام وزن بیت ہے اور نایک مکھیا ہی نہیں بلکہ شہر کا مشہور گنڈا بھی ہے۔ بڑی خیریت ہوئی کہ پربھوسیوک وہاں سے جیتا جاگتا آیا۔ راجہ صاحب بڑی مشکل سے راہ راست پر آئے تھے۔ نایک رام ان سے ضرور فریاد کرے گا اب کے ہماری زیادتی ثابت ہوگی۔ راجہ صاحب کو سرمایہ داروں سے یونہی چڑ ہے۔ یہ حال سنتے ہی جامہ سے باہر ہو جائیں گے۔ پھر کسی طرح ان کا منہ سیدھا نہ ہوگا۔ ساری رات جان سیوک اسی ادھیڑ بن میں پڑے رہے۔ دفعتاً انہیں ایک بات سوجھی۔ چہرہ پر مسکراہٹ کی جھلک دھائی دی۔ ممکن ہے یہ چال سیدھی پڑ جائے تو بگڑا ہوا کام پھر

سے بن جائے۔ صبح کو ناشتا کرنے کے بعد فٹن تیار کرائی اور پانڈے کو روانہ ہو گئے۔

نائیک رام نے پیروں میں پٹیاں باندھ لی تھیں۔ بدن میں ہلدی کی مالش کرائے ہوئے تھے۔ ایک ڈولی منگوا رکھی تھی اور راجہ مہیندر کمار کے پاس جانے کو تیار تھے۔ ابھی مہورت میں دو چار پل کی کسر تھی۔ بجرنگی اور جگدھر بھی ساتھ جانے والے تھے۔ یکا یک فٹن پہنچی تو لوگ متحیر ہو گئے۔ ایک لمحہ میں سارا محلّہ آ کر جمع ہو گیا کہ آج کیا ہو گا۔

جان سیوک نائیک رام کے پاس جا کر بولے۔ ''آپ ہی کا نام نائیک رام پانڈے ہے نا؟ میں آپ سے کل کی باتوں کے لیے معافی مانگنے آیا ہوں۔ جونہی لڑکے نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا، میں نے اسے خوب ڈانٹا اور رات زیادہ نہ گئی ہوتی تو میں اسی وقت آپ کے پاس آتا۔ لڑکا نالائق اور ناتجربہ کار ہے۔ کتنا ہی چاہتا ہوں کہ اس میں ذرا آدمیت آ جائے، پر ایسی اٹی سمجھ ہے یہ کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔ پڑھنے کے لیے ولایت بھیجا۔ وہاں سے بھی پاس ہو آیا، لیکن آدمیت نہ آئی۔ اس کی نادانی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا اتنے آدمیوں کے بیچ میں وہ آپ سے بے ادبی کر بیٹھا۔ اگر کوئی آدمی شیر پر پتھر پھینکے تو یہ اس کی بہادری نہیں بلکہ نادانی ہے۔ ایسا شخص رحم کے قابل ہے کیونکہ دیر میں یا جلد ہی وہ شیر کے منہ کا لقمہ بن جائے گا۔ اس لونڈے کی بجنسہٖ یہی حالت ہے۔ آپ نے مروت نہ کی ہوتی، تحمل سے کام نہ لیا ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ جب آپ نے اتنی رعایت کی ہے تو دل سے ملال بھی نکال ڈالیے۔''

نائیک رام چارپائی پر لیٹ گئے گویا کھڑے رہنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ بولے۔ ''صاحب! دل سے ملال تو نہ نکلے گا چاہے جان نکل جائے۔ اسے چاہے ہم لوگوں کی مروت کہیے چاہے ان کی تقدیر کہیے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے گئے، لیکن ملال تو دل میں بنا ہوا ہے۔ وہ تبھی نکلے گا جب ہم دونوں میں سے ایک نہ رہے گا۔

رہی بھل منسی سو بھگوان نے چاہا تو جلد ہی سیکھ جائیں گے۔ بس ایک برا ہمارے ہاتھ میں پھر پڑ جانے دیجیے۔ ہم نے بڑے بڑوں کو بھلا مانس بنا دیا۔ ان کی کیا ہستی ہے۔''

جان سیوک: اگر آپ اتنی آسانی سے اسے بھل منسی سکھا سکیں تو کہیے آپ ہی کے پاس بھیج دوں۔ میں تو سب کچھ کر کے ہار گیا۔

نا یک رام: بولو بھائی بجرنگی۔ صاحب کی باتوں کا جواب دو۔ مجھ سے تو بولا نہیں جاتا۔ رات کراہ کراہ کر کاٹی ہے۔ صاحب کہتے ہیں ماپھ (معاف) کر دو۔ دل میں ملال نہ رکھو۔ میں یہ سب بیوہار نہیں جانتا۔ یہاں تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا سیکھا ہے۔

بجرنگی: صاحب لوگوں کا یہی دستور ہے۔ پہلے تو مارتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ ہمارے اوپر بھی مار پڑا چاہتی ہے تو چٹ کہتے ہیں ماپھ کر دو۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس نے مار کھائی ہے اس کو بنا مارے کیسے تسکین ہوگی۔

جان سیوک: تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ معافی انتقام کے خوف سے نہیں مانگی جاتی۔ خوف سے آدمی چھپ جاتا ہے۔ دوسروں کی مدد مانگنے دوڑتا ہے۔ معافی نہیں مانگتا۔ معافی آدمی اسی وقت مانگتا ہے جب اس کو اپنی بے انصافی اور زیادتی کا یقین ہو جاتا ہے اور جب اس کا دل اسے شرمندہ کرنے لگتا ہے۔ پربھو سیوک سے تم معافی مانگنے کو کہو تو ہرگز نہ مانے گا۔ تم اس کی گردن پر تلوار چلا کر بھی اس کے منہ سے معافی کا ایک لفظ نہیں نکلوا سکتے۔ اگر یقین نہ ہو تو اس کا امتحان لے لو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ سمجھتا ہے میں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے ان لوگوں نے گالیاں دیں، لیکن میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ آپ لوگوں نے اس کو گالیاں دی ہوں گی۔ شریف آدمی نہ گالیاں دیتا ہے نہ گالیاں سنتا ہے۔ میں جو معافی مانگ رہا ہوں تو اس لیے کہ مجھے یہاں سراسر اس کی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ میں اس کی حرکت پر

دل سے نادم ہوں اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے اس کو یہاں کیوں آنے دیا۔ سچ پوچھیے تو اب مجھے یہ پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں نے اس زمین کو لینے کی بات ہی کیوں اٹھائی۔ آپ لوگوں نے میرے ملازم کو مارا۔ میں نے پولیس میں رپورٹ تک نہ کی۔ میں نے قصد کر لیا کہ اب اس زمین کا نام نہ لوں گا۔ میں آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ آپ لوگوں کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر نہیں بنانا چاہتا۔ اگر تم لوگ خوشی سے دو گے تو لوں گا ورنہ چھوڑ دوں گا۔ کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے۔ جب تک آپ لوگ مجھے معاف نہ کر دیں میرے دل کو چین نہ آئے گا۔

شرارت سادگی کی محض ایک خوفناک شکل ہے۔ صاحب کی شیریں بیانی نے نائیک رام کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ کوئی دوسرا شخص اتنی ہی آسانی سے اس کو صاحب کی گردن پر تلوار چلانے کے لیے آمادہ کر سکتا تھا۔ ممکن تھا پرھوسیوک کو دیکھ کر اس کے سر پر پھر خون سوار ہو جاتا، لیکن اس وقت صاحب کی باتوں نے اس پر جادو سا کر دیا۔ بولا۔ ''بجرنگی کیا کہتے ہو؟''

بجرنگی: کہنا کیا ہے۔ جو اپنے سامنے سر جھکائے اس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ صاحب یہ بھی تو کہتے ہیں کہ اب ہم جمین (زمین) سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے تو ہمارے اور ان کے بیچ میں جھگڑا ہی کیا رہا۔

جگدھر: ہاں جھگڑے کا مٹ جانا ہی اچھا ہے۔ عداوت اور لڑائی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بھیرو: چھوٹے صاحب کو چاہیے کہ آ کر پنڈا جی سے ماپھی (معافی) مانگیں۔ اب وہ کوئی چھوٹے بچہ نہیں ہیں کہ آپ ان کی طرف سے سپارس (سفارش) کریں۔ چھوٹا لڑکا ہوتا تو دوسری بات تھی۔ تب ہم لوگ آپ ہی کو اولہنا دیتے۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مونچھ داڑھی نکل آئی ہے۔ انہیں خود آ کر پنڈا جی سے کہنا سننا چاہیے۔

نا یک رام: ہاں یہ بات پکی ہے۔ جب تک وہ تھوک کر نہ جائیں گے میرے دل سے ملال نہ دور ہوگا۔

جان سیوک: تو تم سمجھتے ہو کہ داڑھی مونچھ آ جانے سے عقل بھی آ جاتی ہے۔ کیا ایسے آدمی نہیں دیکھے ہیں جن کے بال پک گئے ہیں۔ دانت ٹوٹ گئے ہیں اور ابھی تک عقل نہیں آئی۔ پر بھوسیوک اگر بے عقل نہ ہوتا تو اتنے آدمیوں کے بیچ میں پنڈا جی جیسے پہلوان پر ہاتھ نہ چلاتا۔ اسے تم کتنا ہی دباؤ، پر وہ معافی نہ مانگے گا۔ رہی زمین کی بات۔ سو اگر تم لوگوں کی مرضی ہے کہ اس معاملہ کو دبا رہنے دوں تو یہی سہی۔ مگر شاید ابھی تک تم لوگوں نے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ ورنہ کبھی مخالفت نہ کرتے۔ بتلائیے پنڈا جی آپ کو اس معاملہ پر کیا اعتراض ہے؟

نا یک رام: بھیرو اس کا جواب دو۔ اب تو صاحب نے تم کو کائل (قائل) کر دیا۔

بھیرو: کائل کیا کر دیا۔ صاحب یہی کہتے ہیں نا کہ چھوٹے صاحب کو اکل (عقل) نہیں ہے تو وہ کوئیں (کنویں) میں کیوں نہیں کود پڑتے۔ اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ کیوں نہیں کاٹ لیتے؟ ایسے آدمیوں کو کوئی کیسے پاگل سمجھ لے؟

جان سیوک: جو آدمی یہ نہ سمجھے کہ کس موقع پر کون سا کام کرنا چاہیے وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے؟

نا یک رام: صاحب انہیں میں پاگل تو کسی طرح نہ مانوں گا۔ ہاں آپ کا منہ دیکھ کر اس سے بیر نہ بڑھاؤں گا۔ آپ کی بنتی نے میرا سر جھکا دیا۔ سچ کہتا ہوں آپ کی بھل منسی نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ نہیں تو میرے دل میں نہ جانے کتنا گبار (غبار) بھرا ہوا تھا۔ اگر آپ تھوڑی دیر اور نہ آتے تو آج شام تک چھوٹے صاحب اسپتال میں ہوتے۔ آج تک کبھی میری پیٹھ میں دھول نہیں لگی۔ جندگی (زندگی) میں پہلی بار میری اتنی بے عزتی ہوئی اور پہلی بار میں نے ماپھ (معاف) کرنا بھی سیکھا۔ یہ

آپ کی عقل کی برکت ہے۔ میں آپ کی کھوپڑی کو مان گیا۔ اب صاحب کی دوسری بات کا جواب دو بجرنگی۔

بجرنگی: اس میں اب کا ہے کا سوال جواب۔ صاحب نے تو کہہ دیا کہ میں اس کا نام نہ لوں گا۔ بس جھگڑا مٹ گیا۔

جان سیوک: لیکن اگر زمین کے میرے ہاتھ آنے سے تمہارا سولہوں آنے فائدہ ہو تو تم ہمیں نہ لینے دو گے؟

بجرنگی: ہمارا پھائدہ کیا ہوگا؟ ہم تو مٹی میں مل جائیں گے!

جان سیوک: میں تو دکھا دوں گا کہ تمہارا بھرم ہے۔ بتلاؤ تمہیں کیا اعتراض ہے؟

بجرنگی: پنڈا جی کے ہزاروں جاتری آتے ہیں۔ وہ سب اسی میدان میں ٹھہرتے ہیں۔ دس دس بیس بیس دن پڑے رہتے ہیں۔ وہیں کھانا پکاتے ہیں۔ وہیں سوتے ہیں۔ شہر کے دھرم سالوں میں دیہات کے لوگوں کو آرام کہاں۔ یہ دھرتی نہ رہے تو کوئی جاتری یہاں جھانکنے بھی نہ آئے۔

جان سیوک: جاتریوں کے لیے سڑک کے کنارے کھپریل کے مکانات بنوا دیئے جائیں تو کیسا؟

بجرنگی: اتنے مکان کون بنوائے گا؟

جان سیوک: اس کا میرا ذمہ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہاں دھرم شالا بنوا دوں گا۔

بجرنگی: میرے محلّہ کے دوسرے آدمیوں کی گائیں بھینسیں کہاں چریں گی؟

جان سیوک: احاطہ میں گھاس چرانے کا تمہیں اختیار رہے گا۔ پھر اب تم کو اپنا سارا دودھ لے کر شہر جانا پڑتا ہے۔ حلوائی تم سے دودھ لے کر ملائی، مکھن، دہی بناتا ہے اور تم سے کہیں زیادہ خوشحال نظر آتا ہے۔ یہ نفع اس کو تمہارے ہی دودھ سے تو ہوتا ہے۔ تم ابھی یہاں ملائی مکھن بناؤ تو لے گا کون۔ جب یہاں کارخانہ کھل جائے گا تو

ہزاروں آدمیوں کی بستی ہو جائے گی۔تم دودھ کی بالائی بیچو گے دودھ علیحدہ بکے گا۔ اس طرح تمہیں دوہرا منافع ہوگا۔تمہارے اپلے گھر بیٹھے بک جائیں گے۔تمہیں تو کارخانہ کھلنے سے سب نفع ہی نفع ہے۔

نا یک رام: آتا ہے سمجھ میں نا بجرنگی۔

بجرنگی: سمجھ میں کیوں نہیں آتا،لیکن ایک میں دودھ کی ملائی بنالوں گا اور لوگ بھی تو ہیں تو دودھ کھانے کے لیے جانور پالے ہوئے ہیں۔انہیں مشکل پڑے گی۔

ٹھاکر دین: میرے ہی ایک گائے ہے۔چوروں کا بس چلتا تو اسے بھی لے گئے ہوتے۔دن بھر وہاں چرتی ہے،سانجھ سویرے (سویرے) دودھ دوہ کر چھوڑ دیتا ہوں۔دھیلے کا بھی چارا نہیں لینا پڑتا۔جب تو آٹھ آنے روج (روز) کا بھوسہ بھی پورا نہ پڑے گا۔

جان سیوک: تمہاری پان کی دکان ہے نا،ابھی تم دس بارہ آنے کے پیسے کماتے ہو گے۔اس وقت تمہاری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ادھر کی کمی ادھر پوری ہو جائے گی۔ مزدوروں کو پیسے کی پکڑ نہیں ہوتی۔کام سے ذرا فرصت ہوئی کہ کوئی پان پر گرا۔کوئی سگریٹ پر دوڑا۔خوانچہ والوں کی بھی خاصی بکری ہو گی اور شراب تاڑی کا تو پوچھنا ہی کیا۔چاہے تو پانی کو شراب بنا کر بیچو۔گاڑی والوں کی مزدوری بڑھ جائے گی۔ یہی محلّہ چوک کا ٹکڑا ہو جائے گا۔ابھی تمہارے لڑکے پڑھنے کے لیے شہر جاتے ہیں۔تب یہیں مدرسہ کھل جائے گا۔

جگدھر: کیا کہاں مدرسہ بھی کھلے گا؟

جان سیوک: ہاں کارخانہ کے آدمیوں کے لڑکے آخر پڑھنے کہاں جائیں گے؟ انگریزی بھی پڑھائی جائے گی۔

جگدھر: پھیس کچھ کم لی جائے گی؟

جان سیوک: فیس بالکل ہی نہ لی جائے گی۔کم زیادہ کیسی!

جگدھر: تب تو بڑا آرام ہو جائے گا۔

نائیک رام: جس کا مال ہے اسے کیا ملے گا؟

جان سیوک: جو تم لوگ طے کر دو۔ میں تمہیں کو پنچ مانتا ہوں۔ بس اسے راضی کرنا تمہارا کام ہے۔

نائیک رام: وہ راجی ہی ہے۔ آپ نے بات کی۔ بات میں سب کو راجی کر لیا۔ نہیں تو یہاں لوگ من میں نہ جانے کیا کیا سمجھے بیٹھے تھے۔ سچ ہے بد یا بڑی چیز ہے۔

بھیرو: وہاں تاڑی کی دکان کے لیے کچھ دینا تو نہ پڑے گا؟

نائیک رام: کوئی اور کھڑا ہو گیا تو ضرور چڑھاوا پری ہو گی۔

جان سیوک: نہیں تمہارا حق سب سے بڑھ کر سمجھا جائے گا۔

نائیک رام: تو پھر تمہاری چاندی ہے۔ بھیرو۔

جان سیوک: تو اب میں چلوں پنڈا جی۔ آپ کے دل میں ملال تو نہیں ہے۔

نائیک رام: اب کچھ کہلائیے نا۔ آپ کا سا بھلا مانس آدمی کم دیکھا ہے۔

جان سیوک چلے گئے تو بجرنگی نے کہا۔ ''کہیں سور داس راجی نہ ہوئے تو؟''

نائیک رام: ہم تو راجی کریں گے۔ چار ہزار روپے دلا نے ہیں۔ اب اسی سمجھوتہ میں کسل ہے۔ جمین (زمین) رہ نہیں سکتی۔ وہ آدمی اتنا ہشیار ہے کہ ہم لوگ اس سے پیش نہیں پا سکتے۔ یوں ہی نکل جائے گا، تو ہمارے ساتھ یہ سلوک کون کرے گا۔ مفت میں جتنا ملتا ہو تو چھوڑنا نہ چاہیے۔

جان سیوک گھر پہنچے تو ڈنر تیار تھا۔ پربھو سیوک نے پوچھا۔ ''آپ کہاں گئے تھے؟'' جان سیوک نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ہر ایک کام کرنے کو تمیز چاہیے۔ اشعار کہہ لینا دوسری بات ہے۔ کام کر دکھانا دوسری بات! تم ایک کام کرنے گئے۔ محلّہ بھر سے لڑائی ٹھان کر چلے آئے۔ جس وقت میں پہنچا ہوں

سارے آدمی نائیک رام کے دروازہ پر جمع تھے۔ وہ ڈولی پر بیٹھ کر شاید راجہ مہیندر سنگھ کے پاس جانے کو تیار تھا۔ مجھے سب نے یوں دیکھا گویا پھاڑ کھائیں گے، لیکن میں نے کچھ اس طرح تحمل اور انکسار سے کام لیا۔ ان کو دلیلوں اور چکنی چپڑی باتوں سے ایسا ڈھرے پر لایا کہ جب وہاں سے چلا تو سب میرا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ زمین کا معاملہ بھی طے ہوگیا۔ اس کے ملنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔''

پربھوسیوک: پہلے تو سب اس زمین کے لیے مرنے مارنے پر تیار تھے۔

جان سیوک: اور کچھ کسر تھی تو وہ تم نے جا کر پوری کر دی۔ مگر یاد رکھو کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ ''ڈرائینگ مومنٹ'' پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ شکاری جانتا ہے کہ کس وقت ہرن پر نشانہ مارنا چاہیے۔ وکیل جانتا ہے عدالت پر اس کی دلیلوں کا بہترین اثر کب پڑ سکتا ہے۔ ایک مہینہ نہیں ایک دن پہلے میری باتوں کا ان آدمیوں پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ کل تمہاری زیادتیوں نے وہ موقع پیدا کر دیا۔ میں معافی کا خواستگار بن کر ان کے سامنے گیا۔ مجھے دب کر، جھک کر، عاجزی سے انکساری سے اپنے مسئلہ کو ان کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا۔ اگر ان کی زیادتی ہوتی تو میری جانب سے بھی سختی کا اظہار ہوتا۔ اس حالت میں دبنا آئین اخلاق کے خلاف ہوتا۔ زیادتی ہماری طرف سے ہوئی۔ بس یہی میری جیت تھی۔

ایشور سیوک بولے: ''یسوع! اس گناہ گار کو اپنے دامن میں لے۔ برف آج کل بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کیوں اتنی بے دردی سے خرچ کی جاتی ہے۔ صراحی کا پانی تو کافی ٹھنڈا ہوتا ہے۔''

جان سیوک: پاپا معاف کیجیے۔ بلا برف کے پیاس ہی نہیں بجھتی۔

ایشور سیوک: خدا نے چاہا بیٹا تو اس زمین کا معاملہ طے ہو جائے گا۔ آج تم نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔

مسز سیوک: مجھے ان ہندوستانیوں پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔ دغابازی کوئی ان سے

سیکھ لے۔ ابھی سب کے سب ہاں ہاں کر رہے ہیں۔ موقع پڑنے پر سب نکل جائیں گے۔ مہیند رسنگھ ہی نے دھوکا نہیں دیا۔ یہ قوم ہی ہماری دشمن ہے۔ ان کا بس چلے تو ایک عیسائی بھی ملک میں نہ رہنے پائے۔

پربھوسیوک: ماما یہ آپ کی زیادتی ہے۔ پہلے ہندوستانیوں کو عیسائیوں سے کتنی نفرت رہی ہو، لیکن اب حالت تبدیل ہوگئی ہے۔ ہم خود انگریزوں کی نقل کر کے انہیں چڑاتے ہیں۔ ہر موقع پر انگریزوں کی مدد سے انہیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ ہماری سیاسی غلطی ہے۔ ہماری نجات اہل ملک کے ساتھ برادرانہ تعلق رکھنے میں ہے۔ ان پر رعب جمانے میں نہیں۔ آخر ہم بھی تو اسی بھارت ماتا کی اولاد ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے کہ گوری قومیں صرف مذہب کے تعلق سے ہمارے ساتھ برابری کا برتاؤ کریں۔ امریکہ کے حبشی عیسائی ہیں، لیکن وہاں کے گورے ان کے ساتھ کتنا وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ ہماری نجات ہندوستانیوں ہی کے ساتھ ہے۔

مسز سیوک: خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم ان کافروں کی دوستی کو اپنی نجات کا ذریعہ بنائیں۔ ہم حکمرانوں کے ہم مذہب ہیں۔ ہمارا مذہب، ہمارا رواج، ہمارا طرز معاشرت وہی ہے جو انگریزوں کا ہے۔ ہم اور وہ ایک کلیسا میں ایک خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ ہم اس ملک کے حاکم بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ محکوم بن کر نہیں۔ تمہیں شاید کنور بھرت سنگھ نے یہ کلمہ پڑھایا ہے۔ کچھ دن اور ان کی صحبت میں رہ کر شاید تم بھی یسوع سے منکر ہو جاؤ۔

پربھوسیوک: مجھے تو عیسائیوں میں بیداری کے کوئی خاص آثار نظر نہیں آتے۔

جان سیوک: پربھوسیوک۔ تم نے ایک بڑا سنجیدہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ میرے خیال میں ہمارا مفاد انگریزوں سے رشتۂ اخوت قائم کرنے میں ہے۔ انگریز اس وقت ہندوستانیوں کی متفقہ قوت سے متردد ہو رہے ہیں۔ ہم انگریزوں کے دوست بن کر

ان پر اپنی وفاداری کو سکہ جما سکتے ہیں اور من مانی رعایتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ افسوس یہی ہے کہ ہماری قوم نے ابھی تک سیاسی میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ حالانکہ ملک میں ہماری جماعت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے مگر سیاسی دائرہ میں اب تک ہم کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔ ہندوستانیوں میں مل کر ہم گم ہو جائیں گے۔ کھو جائیں گے۔ ان سے الگ رہ کر خاص اقتدار اور خاص عزت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چپراسی نے آ کر ایک خط دیا۔ یہ خط مسٹر کلارک حاکم ضلع کا تھا۔ ان کے یہاں ولایت سے کئی مہمان آئے ہوئے تھے۔ کلارک نے ان کی خاطر سے ایک ڈنر دیا تھا اور مسز سیوک کو مع مس صوفیہ سیوک کے اس میں شریک ہونے کے لیے بلایا تھا۔ ساتھ ہی مسز سیوک سے یہ اصرار بھی کیا گیا تھا کہ صوفیہ کو ایک ہفتہ کے لیے ضرور بلا لیجیے۔

چپراسی کے چلے جانے پر مسز سیوک نے کہا۔ ''صوفی کے لیے یہ سنہری موقع ہے۔''

جان سیوک: ہاں۔ ہے تو پر وہ آئے گی کیسے؟

مسز سیوک: اس کے پاس یہ خط بھیج دوں؟

جان سیوک: صوفی اس کو کھول کر دیکھے گی بھی نہیں۔ اسے جا کر بلا کیوں نہیں لاتیں؟

مسز سیوک: وہ تو آتی ہی نہیں۔

جان سیوک: تم نے کبھی بلایا ہی نہیں۔ آتی کیونکر؟

مسز سیوک: وہ آنے کے لیے کیسی شرط لگاتی ہے۔

جان سیوک: اگر اس کی بھلائی چاہتی ہو تو اپنی شرطیں توڑ دو۔

مسز سیوک: وہ گر جا نہ جائے تو بھی زبان نہ کھولوں؟

جان سیوک: ہزاروں عیسائی کبھی گرجا نہیں جاتے اور انگریز تو بہت کم جاتے ہیں۔

مسز سیوک: خداوند یسوع کی توہین کرے تو بھی چپ رہوں؟

جان سیوک: وہ یسوع کی توہین نہیں کرتی۔ جسے خدا نے ذرا بھی عقل دی ہے وہ خداوند یسوع کی دل و جان سے عزت کرے گا۔ ہندو تک یسوع کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔ اگر صوفی یسوع کو اپنا نجات دہندہ خدا کا بیٹا یا خدا نہیں سمجھتی تو اس پر جبر کیوں کیا جائے۔ کتنے ہی عیسائیوں کو اس قسم کے شکوک ہیں خواہ وہ انہیں علانیہ نہ بیان کریں۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص نیک کاموں کو کرتا ہوا زندگی بسر کرتا ہے اور دل میں ویسے ہی خیالات رکھتا ہے تو وہ اس مسیحی سے کہیں بہتر ہے جو مسیح کا نام تو جپتا ہے پر نیت کا برا ہے۔

ایشور سیوک: یا خدا اس خاندان پر اپنا سایہ پھیلا! بیٹا! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ مسیح کا بندہ کبھی راہ راست سے منحرف نہیں ہوسکتا۔ اس پر مسیح کی نوازش رہتی ہے۔

جان سیوک: (بیوی سے) تم کل صبح چلی جاؤ۔ رانی سے ملاقات ہو جائے گی اور صوفی کو بھی ساتھ لیتی آؤ گی۔

مسز سیوک: اب تو جانا پڑے گا۔ جی تو نہیں چاہتا پر جاؤں گی۔ اسی کی ہٹ رہے۔

سورداس شام کو گھر آیا۔ اس نے سارا حال سنا تو نائیک رام سے بولا۔ ''تم نے میری دھرتی صاحب کو دے دی؟''

نائیک رام: میں نے کیوں دی؟ مجھ سے واسطہ؟

سورداس: میں تو تمہیں کو سب کچھ سمجھتا تھا اور تمہارے ہی بل پر کودتا تھا، پر آج تم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اچھی بات ہے۔ میری بھول تھی کہ تمہارے بل پر پھولا ہوا

تھا۔ یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ اب نیائے کے بل پر لڑوں گا۔ بھگوان ہی کا بھروسہ کروں گا۔

نا یک رام: بجرنگی۔ جرا (ذرا) بھیرو کو بلا لو۔ انہیں سب باتیں سمجھا دے۔ میں ان سے کہاں تک مگج (مغز) لڑاؤں۔

بجرنگی: بھیرو کو کیوں بلاؤں؟ کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ بھیرو کو اتنا سر چڑھا دیا۔ اسی سے اس کو اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے۔

یہ کہہ کر بجرنگی نے جان سیوک کی ساری تجویزیں کم و بیش طریقہ پر بیان کر دیں اور بولا۔ ''بتاؤ جب کارخانہ سے سب کا بھائدہ ہے تو ہم صاحب سے کیوں لڑیں؟''

سورداس: تمہیں بسواس ہو گیا کہ سب کا بھائدہ ہو گا؟

بجرنگی: ہاں ہو گیا۔ ماننے لائق بات ہوتی ہے تو مانی ہی جاتی ہے۔

سورداس: کل تو تم لوگ دھرتی کے پیچھے جان دینے کو تیار تھے۔ مجھ پر شک کر رہے تھے کہ میں نے صاحب سے میل کر لیا۔ آج صاحب کے ایک ہی چکمہ میں پانی ہو گئے۔

بجرنگی: اب تک کسی نے سب باتیں اتنی سپھائی (صفائی) سے نہ سمجھائی تھیں۔ کارخانہ سے سارے محلّہ کا سرے سہر (شہر) کا بھائدہ (فائدہ) ہے۔ مجوروں کی مجوری بڑھے گی۔ دکانداروں کی بکری بڑھے گی۔ ثواب ہم کو۔ جھگڑا نہیں ہے۔ تم کو بھی ہم یہی صلاح دیتے ہیں کہ چوکھے دام مل رہے ہیں۔ دھرتی کو دے ڈالو۔ یوں نہ دو گے تو جا بطے (ضابطے) سے لے لی جائے گی۔ اس سے کیا بھائدہ؟

سورداس: ادھرم اور پاپ کتنا بڑھ جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہے؟

بجرنگی: دھن سے ادھرم ہوتا ہی ہے پر دھن کو کوئی چھوڑ نہیں دیتا۔

سورداس: تو اب تم لوگ میرا ساتھ نہ دو گے؟ مت دو۔ جدھر نیائے ہے ادھر کسی کی مدد کی اتنی بھی جرورت نہیں ہے۔ میری پچ (چیز) ہے۔ باپ دادوں کی کمائی

ہے۔ کسی دوسرے کو اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ اگر دھرتی گئی تو اس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔

یہ کہہ کر سورداس اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر جا کر نیم کے نیچے لیٹ رہا۔

-----------اختتام---حصہ اول--------

☆

(13)

ونے سنگھ کے جانے کے بعد صوفیہ کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ رانی جانہوی مجھ سے کچھ کشیدہ خاطر ہیں۔ وہ اب اس کو کتاب یا اخبار پڑھنے کے لیے یا خطوط لکھنے کے لیے بہت کم بلاتیں۔ اس کے حرکات و سکنات کو بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھتیں۔ اگر چہ وہ کنایتہً بھی اپنی بدگمانی کا اظہار نہ کرتیں، لیکن صوفیہ کو یہ خیال ہوتا کہ مجھ پر شک کیا جا رہا ہے۔ وہ جب کبھی باغ میں سیر کرنے چلی جاتی یا کہیں گھومنے کو نکل جاتی تو واپس آنے پر اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ میری کتابیں الٹ پلٹ دی گئی ہیں۔ یہ بدگمانی اس وقت اور شاق گزرتی جب ڈاکیہ کے آنے پر رانی صاحبہ خود ہی اس کے ہاتھ سے خطوط لیتیں اور نہایت غور سے دیکھتیں کہ صوفیہ کا کوئی خط تو نہیں ہے۔ کئی بار صوفیہ کو اپنے خطوں کے لفافے پھٹے ہوئے ملے۔ وہ ان بدگمانیوں کے راز کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ روک تھام صرف اس لیے ہے کہ میرے اور ونے سنگھ کے درمیان خط و کتابت نہ ہونے پائے۔ پہلے رانی صاحبہ صوفیہ سے ونے اور اندو کا تذکرہ اکثر کیا کرتیں۔ اب بھول کر بھی ونے کا نام نہ لیتیں۔ یہ محبت کا پہلا امتحان تھا!

مگر تعجب یہ تھا کہ صوفیہ میں اب وہ خودداری نہ تھی جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اب وہ نہایت بردبار ہو گئی تھی۔ رانی سے نفرت کرنے کے بجائے وہ ان کی بدگمانی دور کرنے کے لیے موقع و محل کی تلاش کیا کرتی تھی۔ اس کو رانی صاحبہ کا طرف عمل بالکل قرین انصاف معلوم ہوتا تھا۔ وہ سوچتی۔ ''ان کی دلی تمنا ہے کہ ونے سنگھ کی زندگی ایک معیارانہ زندگی ہو اور میں اس کی تربیت میں مخل نہ ہوں۔ میں انہیں کس طرح سمجھاؤں کہ آپ کی تمنا کو میرے ہاتھوں ذرا بھی جھونکا نہ لگے گا۔ میں تو خود ہی اپنی زندگی کو ایک ایسے مقصد کے لیے قربان کر چکی ہوں جس کے لیے وہ کافی نہیں۔ میں خود ہی کسی خواہش کو اپنے مقصد کے راستے کا کانٹا نہ بناؤں گی۔'' لیکن اس کو ایسا

موقع نہ ملتا تھا۔ جو باتیں زبان پر نہیں آسکتیں، ان کے لیے موقع نہیں ملتا۔

صوفیہ کو اکثر اپنے دل کی کمزوریوں پر افسوس ہوتا۔ وہ اپنی طبیعت کو ادھر سے ہٹانے کے لیے مطالعہ کتب میں محو ہو جانا چاہتی، لیکن جب کتاب سامنے کھلی رہتی اور دل کہیں اور جا پہنچتا تو وہ جھنجھلا کر کتاب بند کر دیتی اور یہ سوچتی۔ ''یہ میری کیا حالت ہے۔ کیا میرا نفس یہ بھیس اختیار کر کے مجھے راہ راست سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ میں جان کر کیوں انجان بنی جاتی ہوں۔'' تب وہ عہد کرتی کہ میں اس کانٹے کو دل سے نکال ڈالوں گی۔

لیکن عشق و محبت کے دلدادگان کا عہد بزدلوں کی تمنائے جنگ کے مشابہ ہے جو حریف کا نعرہ سنتے ہی ہوا ہو جاتا ہے۔ صوفیہ ونے کو تو بھول جانا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ ہی اس کو اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ مجھے بھول نہ جائیں۔ جب کئی روز تک ان کا کوئی حال نہ ملا تو اس نے سمجھا۔ ''مجھے بھول گئے۔ ضرور بھول گئے۔ مجھے ان کا پتہ معلوم ہوتا تو شاید ہر روز ایک خط لکھتی۔ روز کئی خط بھیجتی۔ مگر ان کو ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ وہ مجھے بھول جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ وہ ایک عیسائی عورت سے کیوں محبت کرنے لگے۔ ان کے لیے کیا ایک سے ایک نہایت خوب صورت، تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق راجکماریاں نہیں ہیں۔''

ایک روز ان خیالات نے اس کو اس قدر بیتاب کیا کہ وہ رانی کے کمرہ میں جا کر ونے کے خطوط کو پڑھنے لگی۔ دم کے دم میں اس کے سارے خطوط پڑھ ڈالے۔ دیکھوں میری طرف کوئی اشارہ ہے یا نہیں؟ کوئی فقرہ ایسا ہے جس میں سے محبت کی خوشبو آئے، لیکن ایسا ایک لفظ بھی نہ تھا جس سے کھینچ تان کرنے پر بھی وہ کوئی پوشیدہ بات پیدا کر سکتی۔ ہاں اس کوہستانی علاقہ میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کا مفصل تذکرہ کیا گیا تھا۔ جوان العمری کو مبالغہ سے انس ہوتا ہے۔ ہم مشکلات پر فتح پا کر نہیں بلکہ ان کی طولانی صراحت سے اپنا وقار دلوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر

معمولی حرارت ہے تو اسے سرسامی بخار کہا جاتا ہے۔ ایک روز پہاڑوں پر چلنا پڑا تو اسے روزانہ پہاڑوں سے سر ٹکرانا بتلایا جاتا ہے۔ ونے سنگھ کے خطوط اسی قسم کی بہادرانہ داستانوں سے معمور تھے۔ صوفیہ پڑھ کر بے قرار ہوگئی۔ وہ اتنی سختیاں جھیل رہے ہیں اور میں یہاں آرام سے پڑی ہوں۔ وہ اسی سراسیمگی کی حالت میں اپنے کمرہ میں آئی اور ونے کو ایک طولانی خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ خاتمہ پر اس نے نہایت دردناک الفاظ میں استدعا کی کہ مجھے اپنی خدمت میں آنے کی اجازت دیجیے۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس کا انداز بیان نادانستہ طور پر شاعرانہ ہوگیا۔ خط پورا کر کے وہ اسی وقت قریب کے لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

خط چھوڑ دینے کے بعد جب اس کو سکون ہوا تو اسے خیال آیا کہ رانی صاحبہ کے کمرہ میں چھپ کر جانا اور خطوں کو پڑھنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ وہ سارا دن اسی فکر میں پڑی رہی۔ بار بار اپنے کو ملامت کرتی۔ ایشور میں کتنی بدنصیب ہوں۔ میں نے اپنی زندگی سچے مذہب کی تلاش کے لیے وقف کر دی تھی۔ برسوں سچائی کی تحقیقات میں مصروف ہوں مگر نفس کی پہلی ہی ٹھوکر میں نیچے گر پڑی۔ میں کیوں اتنی کمزور ہوگئی ہوں۔ کیا میرا پاک مقصد نفسانی خواہشات کے بھنور میں پڑ کر ڈوب جائے گا۔ میری عادت اتنی بری ہو جائے گی کہ میں کسی کی چیزیں چراؤں گی۔ یہ بات تو کبھی میرے خواب و خیال میں نہ آئی تھی۔ جن کا مجھ پر اتنا اعتبار، اتنا بھروسہ، اتنی محبت، اتنی مہربانی ہے انہیں کے ساتھ میری یہ دغابازی! اگر ابھی یہ حالت تو بھگوان ہی جانے آگے چل کر کیا حالت ہوگی۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ کاش وہ خط جسے میں ابھی ڈال آئی ہوں واپس مل جاتا تو میں اس کو ابھی چاک کر ڈالتی!

وہ اسی تفکر و پشیمانی کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رانی صاحبہ کمرہ میں آ گئیں۔ صوفیہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی آنکھیں چھپانے کے لیے زمین کی طرف تاکنے لگی

لیکن آنسو پی جانا آسان نہیں ہے۔ رانی نے کرخت آواز سے پوچھا۔ ''صوفی کیوں روتی ہو؟''

جب ہم اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں تو سچ بات خود بخود ہمارے منہ سے نکل پڑتی ہے۔ صوفی ہچکتی ہوئی بولی۔ ''جی کچھ نہیں ..... مجھ سے ایک خطا سرزد ہوگئی ہے۔ آپ سے اس کی معافی چاہتی ہوں۔''

رانی نے زیادہ کرخت لہجہ میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

صوفی: آج جب آپ سیر کرنے گئی تھیں تو میں آپ کے کمرہ میں چلی گئی تھی۔

رانی: کیا کام تھا؟

صوفی کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ بولی۔ ''میں نے آپ کی کوئی چیز نہیں چھوئی۔''

رانی: میں تم کو اتنا نیچ نہیں سمجھتی۔

صوفی: ایک ..... ایک خط دیکھنا تھا۔

رانی: ونے سنگھ کا؟

صوفیہ سے سر جھکا لیا۔ وہ اپنی نگاہوں میں خود اتنی ذلیل ہوگئی تھی کہ جی چاہتا تھا زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ رانی نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''صوفی! تم مجھ کو احسان فراموش سمجھو گی مگر میں نے تمہیں اپنے گھر میں رکھ کر بڑی غلطی کی۔ ایسی غلطی میں نے کبھی نہ کی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم آستین کا سانپ بنو گی۔ اس سے بہت بہتر ہوتا کہ ونے اسی روز آگ میں جل گیا ہوتا۔ تب مجھے اس قدر رنج نہ ہوتا، میں تمہارے طرز عمل کو پہلے نہ سمجھی۔ میری آنکھوں پر پردہ پڑا تھا۔ تم جانتی ہو میں نے کیوں ونے کو اتنی جلدی یہاں سے بھگا دیا۔ تمہاری ہی وجہ سے۔ تمہاری محبت کے حملوں سے بچانے کی غرض سے، لیکن اب بھی تم قسمت کی طرح اس کا دامن نہیں چھوڑتیں۔ آخر تم اس سے کیا چاہتی ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ تم سے اس کا بیاہ نہیں ہوسکتا۔ اگر میں حیثیت اور خاندانی رواج کا لحاظ نہ کروں تو بھی